© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

ایک آیت

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ؕ [1]

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا۔ میں زمین میں اپنا نائب مقرر کرنے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا کہ ایسے آدمی کو نائب بنائے گا جو اس میں فساد بپا کرے گا اور خون بہائے گا اور ہم ہیں کہ تیری حمد و ستائش بیان کرتے ہیں اور تیری تقدیس کا اظہار کرتے ہیں۔

قرآن حکیم کی اس آیت میں دورِ فترت کے ان لمحوں کا ذکر ہے، جب ارادۂ الٰہی نے کائنات کے اس پورے نظام کو تکمیل بخشی، جب اس بزمِ عالم نے تیاری و آراستگی کی تمام منزلیں طے کر لیں۔ اور جب فرشِ زمین سے لے کر آسمانوں کے سقفِ زرنگار تک ہر شے نے بناؤ سنوار کے معیاروں کو پالیا، تب خود ضمیرِ کائنات کی دھڑکنیں یہ پوچھ رہی تھیں کہ یہ محفل کون کس کے لیے سجائی جا رہی ہے۔ کون اس برات کا دولہا ہے۔ کسے یہاں رہنا اور زندگی بسر کرنا ہے۔ اور وہ کون ذات اور ہستی ہے جس کے لیے عنایت الٰہی اور ربوبیتِ کبریٰ نے تخلیق و آفرینش کا اتنا بڑا کارخانہ قائم کیا۔

اسی سوال کا دوسرا رخ یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کمال و جمال کے تحقق کی اگلی صورت کیا ہوگی۔ کون علمِ الٰہی کی مشعلوں کو لے کر آگے بڑھے گا۔ کون تخلیق و ایجاد کے کرشموں کو سمجھے گا، اور کون اس دنیا کو کردار و سیرت کی استواری بخشے گا، اور قلب و نظر کی پاکیزگی سے اس کو مالا مال کرے گا۔

اس سوال کے دونوں پہلوؤں کا جچا تلا جواب یہ تھا کہ حضرتِ انسان! جس کو اللہ تعالیٰ کی

---

[1] بقرہ: ۳۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نیابت و نمائندگی سے سرفراز کیا جانے والا ہے۔ ملائکہ کے معنیٰ تکوین کے اس خطِ امتیازی اور نقطۂ آخر کے ہیں جہاں صرف رضا و تسلیم کی کارفرمائی ہے۔ تسبیح و تقدیس کی ادائے دلنواز ہے اور جبر و اضطرار کے حسین و جمیل سانچے ہیں۔ فرشتوں کی تخلیق، ان کے فرائض اور دائرہ کار کا یہ بھی تقاضا تھا کہ ربوبیت کا اگلا قدم اختیار کی طرف اٹھے اور ایک ایسی مخلوق سے یہ کائنات روشناس ہو جو اپنے ارادہ سے جان بوجھ کر اور خطرات و مصائب کو انگیز کرتے ہوئے ان ذمہ داریوں کو قبول کرے جو عاقل و مختار ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ یعنی اس دبستانِ کون میں اب تک جو گلکاریاں ہوتیں، ان کا تعلق قانون کی استواری، فطرت کی بالادستی اور اطاعت و جبر کے حسین و جمیل اور پاکیزہ کرشموں سے تھا۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کے ساتھ ساتھ اختیار و ارادہ کی کارفرمائیوں کو بھی پھلنے پھولنے کے مواقع عطا کیے جائیں۔ اور یہ دیکھا جائے کہ عقل و خرد، اور ارادہ و اختیار کی جدت طرازیاں اس عالم کی رنگینیوں میں کس اضافے کا موجب بنتی ہیں۔

قرآن حکیم کی اس آیت میں انہی سوالات کا جواب دیا گیا ہے۔ اس آیت میں دو نکتوں کی اچھی طرح وضاحت کر دی گئی ہے۔ ایک یہ کہ حضرتِ انسان کا وجود نہ تو بخت و اتفاق کی طرفہ طرازیوں کا رہینِ منت ہے اور نہ مادی ارتقا کا قدرتی نتیجہ، بلکہ یہ تخلیق و آفرینش کے اس ازلی نقشہ کا ضروری جزء ہے جس کو ربوبیت کی فیض رسانیوں نے ترتیب دیا ہے۔ یعنی یہ اس کرۂ ارضی پر اللہ کا نائب اور امین ہے اور اسے ان اخلاقی، روحانی اور عمرانی ذمہ داریوں کو بہر حال پورا کرنا ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہیں اور جن کو اس کی فطرتِ خلاق نے ہنسی خوشی مانا اور تسلیم کیا ہے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَ
أَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝ [۲]

بلاشبہ ہم نے امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا۔ سب نے اس بار کو اٹھانے سے انکار کیا۔ (گویا سب ہی اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ واقعی انسان اپنی جان کو زحمت

---

۲ احزاب : ۷۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ڈالنے والا اور نادان ہے۔

دوسرے یہ کہ اس بارے میں گناہ و ثواب اور خطا و معصیت کی یہ بحث سرے سے بے کار اور بے محل ہے کہ اس کی فطرت مکمل نیکی اور پاکیزگی کی حامل ہے، یا یہ کہ روزِ اول سے روگردانی اور شریعت کی مخالفت اس کی گھٹی میں پڑی ہے۔ بنی آدم کے متعلق ملائکہ کے اس اندیشہ پہ غور کیجیے:

اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا۔

اور اس کے بعد حضرتِ حق کا یہ فیصلہ ملاحظہ فرمائیے:

اِنِّیۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ۔

ملائکہ کا اندیشہ بظاہر بالکل بجا معلوم ہوتا ہے مگر غور کیجیے تو اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ ملائکہ کا یہ اندیشہ انسانی فطرت کے ادھورے مطالعہ پہ مبنی تھا۔ یہی نہیں اس میں خود گناہ اور معصیت کی حقیقت کے بارے میں جو تصور قائم کیا گیا ہے وہ بھی صحت و صواب کی استواریوں سے تہی تھا۔

اللہ تعالیٰ نے جس انسان کو پیدا کرنا چاہا، اس سے ہرگز یہ توقع نہیں کی گئی کہ اس سے کسی لغزش، گناہ اور معصیت کا صدور نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی تمام کمزوریوں کا علم تھا۔ اس کے باوجود جب اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ انسان سطحِ وجود پر فائز ہو تو اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے انسانی زندگی کے وہ تخلیقی و عمرانی پہلو ہیں جن کا تعلق کائنات کے حقیقی ارتقا سے ہے اور جن کا تعلق کائنات میں تخلیق و آفرینش کے مثبت عمل سے ہے۔

خیال کرو اگر اس دنیا میں انسان نہ ہوتا اور اس کے فکر و تدبر کی کارفرمائیاں نہ ہوتیں، تو کیا اس کے سناٹوں اور اندھیروں کو کوئی تہذیب و تمدن کی گہما گہمیوں سے بدل سکتا؟ بلا شبہ اس میں پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیاں ہوتیں۔ دریا اور اس کی طغیانیاں ہوتیں۔ جنگل اور اس کے ہولناک ویرانے ہوتے، مگر یہ رونق، یہ ارتقا انسانی اور زندگی کی یہ نشاط آفرینیاں کہیں نظر نہ آتیں۔ انسانی تخلیق سے منشائے الٰہی یہ تھا کہ اس خرابہ آباد عالم کو انسانی علم و ادراک اور سعی و عمل کی روشنی سے بہرہ مند کیا جاتے اور یہاں ایسی بستیاں بسائی جائیں جو حضرتِ انسان کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کریں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گناہ وثواب کے بارے میں یہ نقطۂ نظر قطعی غیر منطقی اور بیہودیانہ ہے کہ انسان نیکی اور بدی کے دو علیحدہ اور الگ الگ خانوں میں تقسیم پذیر ہے۔ اور اس بنا پر یا تو یہ نیکی کا پیکر کامل ہے اور یا گناہ کا حامل ہے۔ زندگی گناہ وثواب کی ملی جلی دوگونہ کوششوں سے تعبیر ہے۔ گناہ وثواب دو عامل اور دو بنیادی عنصر ہیں جو تہذیب وتمدن کا تانا بانا تیار کرتے ہیں اور تکوینی سطح پر دونوں کا کردار یکساں تعمیری اور مثبت ہے۔ اللہ تعالیٰ صرف یہ چاہتے ہیں کہ انسان زندگی کی دوڑ میں نیکی اور بدی کے درمیانی فاصلوں سے آگاہ رہے۔ شر سے بچے اور شر کا تجربہ کرے، اس کے اسباب وذرائع پر قابو پائے اور اس طرح اس سے فرد ومعاشرہ کو نجات دلانے کی کوشش جاری رکھے۔ اور اگر بتقاضائے بشری اس دوڑ اور سعی میں اس سے کوئی لغزش یا گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ گناہ ومعصیت کا ارتکاب زندگی کا روگ بن جائے اور نیکی اور سعادت وارتقا کی طرف اس کی تگ وتاز کو روک دینے کا باعث ہو۔ اسے چاہیے کہ توبہ واستغفار کے مرحلہ سے تازہ دم ہو کر نکلے اور اپنے سفر کو دوبارہ زیادہ جوش، زیادہ محبت اور زیادہ اخلاص کے ساتھ از سرِ نو شروع کر دے۔ گناہ یا معصیت کوئی ایسا داغ اور دھبا نہیں جو ایک دفعہ اگر دامنِ عمل پر پڑ جائے تو عمر بھر چھٹائے نہ چھوٹ سکے۔ گناہ اور معصیت کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس کا تعلق ذہن وفکر کے ایک غلط تاثر سے ہے اور اگر اس تاثر کو بدل دیا جائے تو گناہ کے اثرات بھی لوحِ قلب سے مٹ جاتے ہیں۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا:

التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ[۳۰]

فرض کیجیے، ایک مسافر، ایک منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ کم علمی یا غلط رہنمائی کی وجہ سے وہ غلط راستے پر پڑ جاتا ہے۔ اور پھر جونہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ راستہ منزلِ مقصود کی طرف نہیں جاتا تو وہ غلط روی کو مستقل عارضہ بنائے بغیر جلدی سے اس راہ پر ہو لیتا ہے جو صحیح ہے اور غلط راستے کو چھوڑ دیتا ہے۔ گناہ وثواب کے معاملہ میں یہی طرزِ فکر انسان کو اختیار کرنا چاہیے، کیونکہ یہی طرزِ فکر معقول اور درست ہے۔

---

[۳۰] ابن ماجہ۔ زہد ۳۰

© rasailojaraid.com